مسلم مفکرین کا نظریہ تاریخ: قرآنی آیات کی روشنی میں

سلطان شمس الحق*
مستفیض احمد علوی**

تعارف:

ماضی کے واقعات کی تفصیل، اگر وقت وقوع کی نشاندہی کے ساتھ بیان کی جائے تو اسے تاریخ کہتے ہیں۔ عربی زبان سے ماخوذ لفظ تاریخ کا بنیادی مادہ ا۔ر۔خ ہے، جو فعل کی صورت میں آئے تو وقت کی نشاندہی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔[1] تاریخ کا انگریزی متبادل History ہے جو کہ قدیم یونانی لفظ Istoria سے ماخوذ ہے، جس کے لغوی معنی تحقیق وتدقیق کے ہیں۔[2] یہ لفظ یونانی سے لاطینی اور لاطینی سے انگریزی میں منتقل ہوا۔ جسے انسانی زندگی کے حالات وواقعات کے ساتھ منسوب کردیا گیا۔ لہٰذا یہ طے ہوا کہ History علم کی وہ شاخ ہے جو ماضی کے واقعات سے متعلق ہو۔[3]

قدیم یونانی مورخ ہیروڈوٹس (Herodotus: 484-425 BC) کا خیال تھا کہ تاریخ وہ علم ہے جو بنی نوع انسان کے عمل سے متعلق ہے:

History is a science of human action.[4]

جب کہ ارسطو (Aristotle: 384-322 BC) سمجھتا تھا کہ تاریخ فقط طبیعی حقائق کو جمع کرنے کا نام ہے:

History is a mere collection of empirical facts.[5]

خود علم تاریخ کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ انسان کے نظریہ تاریخ میں انقلابی تبدیلی اس وقت واقع ہوئی جب نزول قرآن شروع ہوا اور قرآن حکیم نے تاریخ انسانی کے ارتقاء اور عروج وزوال کا فلسفہ، اپنے تاریخی بیانیے میں کھول کر بیان کر دیا۔ جس میں سب سے بڑا اور بنیادی قانون مکافات عمل کا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو قرآن سے مستنبط ہونے والے علوم میں سے قصص وامثال کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ قوموں کی اجتماعی اخلاقیات کا، اس قوم کے عروج وزوال سے گہرا تعلق ہے۔ لہٰذا، تاریخ کا علم، ماضی کے دروس عبر سے مزین ہے، جس کی بنیاد پر، مستقبل کی منصوبہ بندی استوار ہوتی ہے۔

---

*پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ علوم اسلامیہ، گفٹ یونیورسٹی، گوجرانوالہ، پاکستان
**ڈائریکٹر فیکلٹی آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز، گفٹ یونیورسٹی، گوجرانوالہ، پاکستان

قرآنی آیات سے مستنبط فلسفہ تاریخ:

قرآن حکیم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی تخلیق و تشکیل اور اور اس کا انتظام و انصرام، جن قوانین اور طریقوں پر قائم ودائم ہے، وہ خالق کائنات کی مشیت اور قدرت کے تابع ہیں۔ اللہ رب العالمین کی طرف سے تشکیل، ارتقاءاور عروج وزوال کی ساری ترکیب و ترتیب جاری وساری ہے۔ آیات قرآنی کے مطالعہ اور تفہیم کی روشنی میں یہ حقیقت بھی علمائے تفسیر نے واضح کی ہے کہ، اس کائنات کے ایک اہم حصے یعنی زمینی دنیا پر موجود، حیاتِ انسانی کو بھی الٰہی قوانین مشیئت وقدرت کے تحت منظم کیا گیا ہے، جن کے تحت انسانی زندگی، تاریخ و تعمیر سے لے کر عروج وزوال تک پابند رہتی ہے۔ ایسے اصول و قوانین قرآن کی اصطلاح میں سنن الٰہیہ (Divine Laws) کہلاتے ہیں۔

آیات الٰہی سے واضح اشارہ ملتا ہے کہ انسان غور وفکر کے ذریعے کائنات کے اسرار ورموز جان کر ان قوانین سے باخبر ہوتا رہے اور اپنے منصب کے مطابق اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا رہے، تاکہ فلاح وکامرانی اسے نصیب ہوسکے، جیسا کہ فرمایا گیا:

﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ وَاخْتِلاَفِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنزَلَ اللّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِن مَّاء فَأَحْيَا بِهِ الأرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِن كُلِّ دَآبَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخِّرِ بَيْنَ السَّمَاء وَالأَرْضِ لآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ﴾ [6]

(آسمان اور زمین کی پیدائش، رات دن کا ہیر پھیر، کشتیوں کا لوگوں کو نفع دینے والی چیزوں کو لیے ہوئے سمندروں میں چلنا، آسمان سے پانی اتار کر مردہ زمین کو زندہ کرنا، اس میں ہر قسم کے جانوروں کو پھیلادینا، ہواؤں کے رخ بدلنا اور بادل جو آسمان اور زمین کے درمیان مسخر ہیں، ان میں عقل مندوں کے لئے قدرتِ الٰہی کی نشانیاں ہیں۔)

قرآن حکیم سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ رب العالمین نہ صرف اس کائنات کا خالق ہے بلکہ مالک وآقا بھی ہے۔ یہ کل کائنات اسی کی ملکیت ہے اور اسی کے قوانین وضوابط کی پابند بھی ہے: ﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ﴾ [7] (بڑا عالی شان ہے وہ (اللہ) جس کے ہاتھ میں (ساری) حکومت ہے اور وہی ہر چیز پر قادر ہے۔) یہ بھی حقیقت ہے کہ پوری کائنات اس کے حکم کی تابع فرمان ہے اور اس کے احکام کی سرِ موانحراف نہیں کرتی بلکہ ان کا خدا سے تعلق نہایت تعبدانہ ہے:

﴿وَ الشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِؕ وَ الْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَ لَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِؕ وَ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ﴾[8]

(اور سورج کے لیے جو مقرر رہ ہے وہ اسی پر چلتا رہتا ہے یہ ہے اندازہ غالب باعلم اللہ تعالیٰ کا۔اور چاند کی ہم نے منزلیں مقرر کر رکھی ہیں یہاں تک کہ وہ لوٹ کر پرانی ٹہنی کی طرح ہو جاتا ہے۔نہ آفتاب کی یہ مجال ہے کہ چاند کو پکڑے اور نہ رات دن پر آگے بڑھ جانے والی ہے اور سب کے سب آسمان میں تیرتے پھرتے ہیں۔)

قرآن مجید اس پوری کائنات کو "مسلم" قرار دیتا ہے کہ وہ خدا کے ان قوانین واحکام کی فرماں برداری میں سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہے۔انسان کو چونکہ عقل و شعور کی نعمتوں سے فیضیاب کیا گیا ہے، لہٰذا اس کے لیے شایان شان ہی یہ بنتا ہے کہ کائنات سے جو سبق واضح ہے اسی کے آگے سر تسلیم کر کے کائنات کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے:

﴿فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴾[11]

(پس یک سو ہو کر اپنا رخ اس دین کی سمت میں جما دو، قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی بنائی ہوئی ساخت تبدیل نہیں ہو سکتی۔)

قرآن حکیم نے یہ بھی اعلان فرمایا ہے کہ اللہ کے قوانین تبدیل نہیں ہوتے۔زمین سے لے کر آسمان تک اور آدم سے لے کر آخری انسان تک یہی قوانین رہیں گے اور ان کے نتائج بھی وہی رہیں گے جو روزِ اول سے مقرر کیے گئے ہیں۔کسی فرد، قوم، ملک وملت یا کسی خاص خطے کے افراد یا کسی بھی مذہب کے کے ماننے والوں کے لئے اس میں استثنیٰ نہیں ہے۔

ارشادِالٰہی ہے:

﴿فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيلاً وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيلا﴾ [10]

(سو آپ اللہ کے دستور کو کبھی بدلتا ہوا نہ پائیں گے اور آپ اللہ کے دستور کو کبھی منتقل ہوتا ہوا نہ پائیں گے۔)

قرآن حکیم میں بیان شدہ اس حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے مفسرین نے لکھا ہے کہ "سنن الٰہیہ" سے مراد وہ مخصوص قوانین واصول ہیں جن کے تحت خدا تعالیٰ تمام اقوام وملل اور افرادِ معاشرہ کی زندگی کے سلسلے قائم رکھے ہوئے ہے۔علامہ زمخشری(1078ء- 1144ء) ،امام قرطبیؒ(1214ء-1274ء) اور امام الشوکانی

(1759ء-1839ء) کے مطابق ایام و تاریخ اقوام وہ واقعات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے جھٹلانے والی امتوں میں جاری کیے۔[11] علامہ ابن تیمیہ (1263ء-1328ء) فرماتے ہیں کہ تاریخِ انسانی میں مختلف تہذیبوں اور معاشروں کے ساتھ خدا کے وہ معمولات جو نظائر کی شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں اور ان نظائر کی روشنی میں ہم کسی بھی موجود انسانی معاشرے کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ اللہ ان کے ساتھ کیا معاملہ کرے گا کیونکہ اس کی نظیر ہمارے سامنے تاریخ میں موجود ہوتی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

> هی العادة التی تتضمن ان یفعل فی الثانی کما فعل نظیرة الاول۔[12]
>
> (ایسا معمول جو اس بات پر متضمن ہو کہ جو پہلے کے ساتھ ہوا اس کی نظیر اور اس کی ملتی جلتی صورت کے ساتھ بھی وہی ہوگا۔)

علامہ رشید رضا اپنی تفسیر 'المنار' میں فرماتے ہیں کہ یہ خدائے بزرگ و برتر کا ایک نظام ہے جو اقوام و ملل اور افراد و امم کے لیے وضع کیا گیا ہے اور اسی کے مطابق ان سے معاملات کیے جاتے ہیں اور اس نظام میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔[13]

سنن الٰہیہ کا اطلاق، انسانوں سے متعلق اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قواعد و ضوابط پر ہوتا ہے، جن کے مطابق کاروبار حیات انسانی جاری و ساری رہتا ہے۔ تاہم اس سلسلہ میں انسان کا معاملہ دیگر مخلوق سے الگ دائرے رکھتا ہے۔ علامہ ابن تیمیہ، انسانی زندگی سے متعلق قوانین کے بارے میں لکھتے ہیں:

> وهذه السنن کلها سنن تتعلق بدينه ، وأمره ونهيه ، ووعده ووعيده، وليست هي السنن المتعلقة بأمور الطبيعة،كسنته في الشمس والقمر والكواكب وغير ذلك من العادات۔[14]
>
> (یہ وہ تمام سنن ہیں جن کا تعلق اس کے دین، اس کے اوامر و نواہی، اس کے وعدہ و وعید سے ہے اور یہ وہ سنن نہیں ہیں جو طبعی امور جیسے کہ سورج، چاند اور دیگر اجرامِ فلکی میں جاری و ساری ہیں۔)

ڈاکٹر عبدالکریم زیدان، ان دونوں قسم کے قوانین کو دو دیگر اصطلاحات سے موسوم کرتے ہیں، مگر ان کے ہاں بھی، اپنے مفہوم کے اعتبار سے سنن کی دو صورتیں ہی نظام دنیا و مافیہا میں کارگر نظر آتی ہیں، اور دونوں میں گونا فرق ہے؛ ایک کائنات کے مادی واقعات ہیں یعنی الأحداث الكونية المادية ، اور دوسرے انسانی معاشرت سے متعلق قوانین یعنی الأحداث الاجتماعية ۔ وہ لکھتے ہیں:

وكل الفرق بين الأحداث الكونية المادية وبين الأحداث الاجتماعية هو أن أسباب الأولى واضحة بينة مضبوطة إذا عرفناها أمكننا الحكم بدقة على نتائجها وميقات هذه النتائج ، فالماء مثلا ينجمد إذا بلغت درجة برودته كذا درجة ، ويصل إلى الغليان إذا وصلت درجة حرارته إلى كذا درجة وبعد كذا من الوقت ،۔۔۔

(کائنات کے مادی واقعات اور معاشرتی واقعات میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ پہلے کے اسباب واضح روشن اور منضبط ہیں۔جب ہم ان کو جان لیں تو ہمارے لئے تفصیل کے ساتھ ان نتائج پر حکم لگانا اور ان نتائج کا وقت مقرر کرنا ممکن ہوتا ہے۔مثلاً درجہ حرارت اس نقطہ تک پہنچ جائے تو پانی جم جاتا ہے اور جب اس حد کو پہنچ جائے تو ابلنے لگتا ہے۔)

جب کہ انسانی سماج میں تبدیلی کے واقعات کا معاملہ دوسرا ہے:

وهكذا.أما أسباب الأحداث الاجتماعية فهي بمختلف أنواعها من سياسية واقتصادية وحضارية وعمرانية وغلبة ونصر وهزيمة وخذلان..إلخ.، أسباب دقيقة وكثيرة ومتشعبة ومتشابكة ، وقد يعسر على الكثيرين الإحاطة بها تفصيلا ۔[15]

(معاشرتی واقعات اپنے اسباب اور اپنی مختلف سیاسی اقتصادی تمدنی یا تہذیبی، نصرت اور شکست وذلت وغیرہ جیسی انواع کی حیثیت سے مختلف ہو جاتے ہیں ۔یہ اسباب بڑے گہرے ،بہت زیادہ باہم ملے جلے اور منتشر ہیں۔بہت سارے لوگوں کے لئے ان کا تفصلی احاطہ کرنا مشکل ہو سکتا ہے۔)

قرآن مجید کی بہت سی آیات اس حقیقت سے پردہ اٹھاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے آدم کو جو خاص فضیلت وعظمت اور عزت وشرف عطافرمایا وہ کسی اور مخلوق کے حصے میں نہیں آیا۔ساری کائنات کا نظام وانصرام انسان کی مدد اور خدمت میں لگاہوا ہے۔زمین وآسمان کی ساری چیزیں اسی کے تابع اور مسخر کی گئی ہیں۔[16] انسان کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو الٰہی قوانین پر عمل پیرا ہو کر سعادتِ دارین حاصل کر لے ،چاہے تو ان قوانین سے ناشکری اور بغاوت کر کے بد بختی کو اپنا مقدر بنالے۔اسے اچھے برے کو اختیار کرنے کا اختیار دے کر صحیح اور غلط کی پہچان کرادی گئی ہے لیکن راہ عمل اختیار کرنے میں اسے پورا امختار بنادیا گیا ہے:

﴿اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا﴾[17]

(ہم نے اسے راہ دکھائی اب خواہ وہ شکر گزار بنے خواہ ناشکرا۔)

دوسرے مقام پر قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ یوں آیا ہے:

﴿وَ مَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ﴾[18]

(شکر گزار اپنے ہی نفع کے لیے شکر گزاری کرتا ہے اور جو نا شکری کرے تو میرا پروردگار بے پرواہ اور بزرگ ہے۔)

ڈاکٹر فصل الرحمان(1919-1988ء) نے اسی بات کو یوں بیان کیا ہے:

Since everything in the universe does behave in accordance with its ingrained laws automatically obeys the "command" of God, the whole universe is therefore Muslim, surrendering to the will of God. Man is the only exception to this universal law, for he is the only being endowed with a free choice of obeying or disobeying the command of God. Just as it is "written into" every other creature, this command is written upon man's heart. The only difference is that while every other creature follows its nature automatically, man ought to follow his nature; this transformation of the "goes" into "ought" is both the unique privilege and the unique risk of man.[19]

(چونکہ کائنات میں ہر چیز ان قوانین کے مطابق عمل کرتی ہے جو اس کے اندر رکھ دیے گئے ہیں یعنی خود بخود خدا کے حکم کی تابعداری کرتی ہے اس لیے پوری کائنات ہی اس اعتبار سے "مسلم" ہے جو خدا کی مرضی کے سامنے سر جھکا دیتی ہے۔اس عالم گیر قانون میں واحد استثناء انسان ہے، اس لئے کہ وہ واحد وجود ہے جسے یہ اختیار دیا گیا ہے کہ خدا کے حکم کی اطاعت کرے یا نافرمانی کرے ٹھیک اسی طرح جیسے یہ حکم ہر دوسری مخلوق کے اندر " لکھ دیا گیا ہے " اس طرح یہ حکم انسان کے دل پر لکھ دیا گیا ہے۔۔۔فرق صرف اتنا ہے کہ جہاں ہر دوسری مخلوق خود بخود اپنی فطرت کے مطابق چلتی ہے ،انسان کو " چاہیے " کہ اپنی فطرت کے مطابق چلے ، یہ جو " چلتی ہے " کا " چلنا چاہیے " میں بدل جانا ہے تو یہ انسان کا غیر معمولی حق بھی ہے اور اس کے لئے غیر معمولی طرہ بھی!)

غلام احمد پرویز(1903ء-1985ء) انسان کے اس اختیار وانتخاب کی توضیح یوں کرتے ہیں:

ہماری کائنات کے دو حصے ہیں۔ایک حصہ عالم آفاق (یعنی انسانوں کے دنیا کے سوا باقی ساری کائنات)اور دوسرا حصہ ،انسانی دنیا۔اگر تم اس بنیادی فرق کو پیشِ نظر رکھو تو مسئلہ تقدیر کی بہت سی پیچیدگیاں خود بخود حل ہو جائیں گی۔عالم آفاق میں خدا کا قانون از خود کار فرما ہے اور کسی کو اس سے سر تابی کی مجال نہیں (کل لہ قا نتون) لیکن انسان کو صاحبِ ارادہ پیدا کیا گیا ہے۔یہ اپنی مملکت میں آپ صاحبِ اختیار ہے، لیکن جس طرح عالم آفاق کی نشو و نما ربوبیت ایک قانون کے تابع ہوتی ہے اسی طرح عالم انسانی کی نمود وارتقاء بھی ایک نظام کے ماتحت کار فرما ہوتی ہے ۔عالم آفاق میں ہر شے کو اس قانون کی پابندی طوعاًو کرھاً کرنی پڑتی ہے ،اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ "تقدیر" کے پابند ہیں یعنی ان اندازوں کے پابند جو ان کی نقل و حرکت اور نشو و نما کے لئے مقرر ہیں اور جن سے انہیں کسی صورت میں بھی مفر نہیں۔اس کے بر عکس عالمِ انسانیت میں یہ قانون، ہدایت خداوندی کی شکل میں موجود رہتا ہے، لیکن انسان کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ اس پر عمل کرے یا نہ کرے۔ بالفاظ دیگر اشیائے کائنات تخلیقی قانون کی پابندی مجبوراً کرتی ہیں ،جو ان کے اندر ودیعت کر کے رکھ دیا گیا ہے لیکن انسان ، قانونِ خداوندی کی پابندی اپنے اختیار سے کرتا ہے جو اسے انبیاء کی وساطت سے ملتا ہے۔[20]

علامہ اقبال نے ،اسے یوں بیان کیا ہے :

تقدیر کے پابند ہیں نباتات و جمادات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند [21]

قرآن مجید عمل تاریخ کو قانون مکافات عمل یا جزاوسزا کا نتیجہ قرار دیتا ہے اس کا دعویٰ ہے کہ قوموں کے اجتماعی اعمال خواہ اچھے ہوں یا برے، ایک مقرر وقت پر نتائج ضرور دیتے ہیں، جیسا کہ ارشاد ہوا :

﴿لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ-﴾[22]

(ہر قوم کے لیے ایک مدت مقرر ہے، لہٰذا جب ان کا وقت آ جاتا ہے تو پھر کوئی لمحہ تاخیر یا تقدیم نہیں ہوتی۔)

اور اسی طرح، قرآن حکیم میں یہ امر بھی واضح کیا گیا ہے کہ کسی قوم کی اجتماعی حالت اسی وقت آتی ہے جب وہ خود اپنے آپ کو تغیر کے لیے تیار کر لیتی ہے، لہٰذا، ارشاد ہوتا ہے کہ :

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ ﴾[23]

(بے شک اللہ تعالیٰ کسی قوم کے حالات نہیں بدلتا، جب تک وہ خود اپنے آپ نہ بدلیں۔)

چنانچہ جہاں کہیں قرآن گذشتہ قوموں کی تباہی کا ذکر کرتا ہے وہاں اس بات کی تصریح بھی ضرور کر دیتا ہے کہ جو عذاب یا تباہی کسی قوم پر وارد ہوئی ہے یہ اصل میں انہی کے اعمال کا نتیجہ تھی:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَلَكِنَّ النَّاسَ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ﴾[24]

(یقیناً، اللہ تعالیٰ انسانوں پر کسی طرح ظلم نہیں کرتا لیکن انسان خود اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔)

گویا، واقعات تاریخ اور انقلابات عالم، انسان کے اپنے اعمال کا براہ راست نتیجہ ہیں۔ تاہم تاریخ خود اپنے مستقل قوانین رکھتی ہے جو تقدیر اور تدبیر کے امتزاج پر مبنی ہیں۔

متقدم علمائے تاریخ کا نقطہ نظر:

المسعودی(896 -956ء) کہتے ہیں کہ تاریخ کوئی جامد اور ساکت شئے نہیں ہے، جس طرح قومیں اور معاشرے سیاسی تبدیلیوں کے ساتھ اپنے مزاج تبدیل کرتی رہتی ہیں، اسی طرح ان کی تاریخ تبدیل ہو رہی ہوتی ہے۔ مؤرخ کا منصب یہ ہے کہ اس بات کا خیال رکھے کہ حکومتی تبدیلی کے ساتھ قوم میں کیا کیا تغیرات رو پذیر ہوئے، وہ ان پر نظر رکھ کے تجزیہ کرتا جائے۔[25] لہٰذا، ابن مسکویہ(932 – 1030ء) نے تاریخ نگاری کو واقعات نگاری تک محدود رکھنے کی بجائے، مؤرخ کے لیے ضروری قرار دیا کہ وہ واقعات کے پس منظر میں موجود، اسباب و علل کا کھوج لگانے کا کام کرے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

متبدّدة فی الخرافات والأساطير الّتی ليست لها فائدة الأاستجلاب النّوم بها، والتأنس بالمستطرف منها۔[26]

(تاریخی واقعات اور خرافات باہم گڈمڈ ہوگئے ہیں، حالانکہ واقعات اور قصّوں سے اس کے سوا اور کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا کہ ان کو سن کر نیند آئے اور ان کی اعجوبگی سے دلچسپی لی جائے۔)

ایک مؤرخ کے شایان شان یہ ہے کہ وہ ماضی کے واقعات کو اسباب و علل کی روشنی میں پرکھے، اور اس طرح بیان کرے کہ آنے والی نسل انسانی کے لیے عبرت اور سبق آموزی کا سامان میسر ہو۔ گویا، تاریخ نام ہے انسانی اعمال اور تجربات کے جملہ محرکات اور دنیا میں عمل پذیر ان کے اثرات کا۔ لہٰذا، علم تاریخ وہ شعبہ فکر ہے جس میں انسانی تہذیب و تمدن کے آغاز و ارتقاء، نشیب و فراز اور ان کے محرکات و اثرات سے آگہی حاصل کی جاتی ہے۔

برصغیر کی مسلم تاریخ نویسی کی روایت میں ضیاءالدین برنی(1285 – 1357ء) نے سب سے پہلے قلم اٹھایا۔ ان کے خیال میں تاریخ سے اہل بصیرت اس طرح فیض یاب ہوتے ہیں جس طرح وہ آسمانی صحائف سے مستفید ہوتے ہیں۔ ماضی کا مطالعہ کرنے سے قاری، شعوری طور پر ماضی میں سفر کرتا ہے۔ جن عظیم ہستیوں کی

تاریخ وہ جان رہا ہے، دراصل وہ اس کے شعور پر اپنی عظمت کے گہرے نقوش ثبت کرتے ہیں، اور اہل بصیرت اپنی عظمت کے اصول اسی تاریخ سے اخذ کر لیتے ہیں۔ برنی کے مطابق:

علم تاریخ اخبار اوصاف بزرگی وذکر محامد و مناقب و ماثر بزرگان دین دولت است۔[27]

(تاریخ میں بزرگان دین و دولت کے اوصاف اور ان کی بزرگی و کمالات، ان کے مناقب و اثرات کا بیان ہوتا ہے۔)

لہٰذا، تاریخ عقل و شعور بڑھاتی ہے انسان دوسروں کے تجربوں کا مطالعہ کر کے خود صاحب تجربہ ہو جاتا ہے اور دوسرں کو جو حوادث پیش آئے ہیں ان کا علم تاریخ جاننے والوں کو محتاط بنا دیتا ہے۔ اسی بات کو وہ یوں بیان کرتے ہیں:

در علم تاریخ آنست که در علم تاریخ واسطه زیادتی عقل و شعور ووسیله درستی رای و تدبیر است و از مطالعه تجارب دیگران شخص صاحب تجربه میگردد و از دانستن تجربه حوادث دیگر در تاریخ حزم پیدا می اید۔[28]

برنی نے سلاطین خلفاء پر صوفیا کو ترجیح دی ہے۔ان کے مطابق صوفی کی شخصیت سلطان سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ انبیاء اور صالحین کے حالات پڑھ کر انسان میں صبر قناعت اور تسلیم ورضا کی خو پیداء ہوتی ہے:

ایشاں حوادث ووقائع رابرضا و صبر باعث رضا وصبر دانندگان تاریخ میگردد۔[29]

علامہ ابن خلدون (1332 – 1406ء) لکھتے ہیں کہ بطور علم و فن، تاریخ ایک بنیادی اور اعلیٰ مقام رکھتا ہے:

اعْلَمْ أنَّ فَنَّ التَّارِيخِ فَنٌّ عَزِيزُ المَذْهَبِ، جَمُّ الفَوَائِدِ، شَرِيفُ الغَايةِ، إذْ هُو يُوقِفُنا عَلَى أَحْوَالِ المَاضِينَ مِنَ الأُمُمِ في أَخْلَاقِهِم، والأَنْبِيَاءِ في سِيَرِهِم، والمُلُوكِ في دُوَلِهِم وسيَاسَتِهِم، حَتَّى تَتِمَّ فَائِدَةُ الإقْتِدَاءِ في ذَلِكَ لِمَنْ يَرُومُه في أَحْوَالِ الدِّينِ والدُّنيا۔[30]

(واضح رہے کہ تاریخ ایک بلند مرتبہ شعبہ علم اور کثیر الفوائد، خوش نتائج فن ہے۔اس لیے کہ وہ ہمیں سابقہ امتوں کے اخلاقی حالات، انبیاء کی سیرتوں اور سلاطین کی حکومتوں اوران کی سیاستوں سے روشناس کراتا ہے۔ تاکہ جو شخص دینی اور دنیاوی معاملات میں ان میں سے کسی کی پیروی کرنا چاہے تو اس کا دامن فائدے سے خالی نہ رہے۔)

مُلا عبدالقادر بدایونی(1540–1605ء)، سلطنت مغلیہ ہند میں، دورِ اکبری کے ایک نامور مؤرخ ہیں، ان کے خیال میں وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے نورِ یقین سے سرفراز کیا ہے اور توفیق الٰہی ان کے ہمراہ رہتی ہے، اس عالم کون و فساد میں رونما ہونے والے ہر سانحہ اور حادثہ کو صانعِ قدرت کی حکمت و قدرت کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔[31]

ان کا کہنا ہے کہ اگر ہم بغور مطالعہ کریں تو یہ بات چھپی نہیں رہتی کہ یہ دنیا بذات خود ایک قدیم صحیفہ ہے جس کا آغاز و انجام تو ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے لیکن اس کا ہر ورق افرادِ انسانی پر گزرنے والے احوال و حوادث کا مرقع اور ان لوگوں کے کارہائے نمایاں کا مجموعہ ہے جن کے ہاتھوں میں مخلوق خدا کی باگ ڈور رہی ہے۔یعنی ہر گذشتہ تہذیب اپنی کہانی خود بیان کر گئی ہے۔اس تہذیب نے کس حد تک اس دنیا کو متاثر کیا اور اس کی روداد زوال کیا ہے، یہ تاریخ کے آئینے میں محفوظ ہے:

> علم تاریخ در حدذات علمی ست شریف و فنیت لطیف چه سرمایه عبرت ارباب خبرت وسنه حب تجربه اہل ودانش وبینش ست۔[32]
>
> (علم تاریخ بذاتہ ایک علم شریف اور فن لطیف ہے۔اس لیے کہ اہل خبر کا سرمایہ عبرت اور اہل عقل کا آئینہ تجربات ہے۔)

اگرچہ، کشف الظنون میں حاجی خلیفہ(1609 – 1657ء)نے تاریخ کی تعریف یوں کی کہ:

> هُوَمَعْرِفَةُ أحْوَالِ الطوائفِ و بُلْدَانِهْم وَرَسُومِهْم وَعَادَاتِهْم وَصَنائِعِ اَشْخَاصِهِمْ وَ اَنْسَابِهْم ووَفْيَاَتِهْم۔[33]
>
> (یہ وہ علم ہےجس میں انسانی طبقات ، ان کے شہروں، رسوم ورواج، ان کی عادات ایجادات، ان کے نسب اوروفات کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے۔)

مگر وہ بھی جانتے تھے کہ تاریخ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے! کیونکہ حقائق کی تلاش اور واقعات کے انتخاب میں مؤرخ کا طریقہ کار سائنسی ہوتا ہے، یعنی وہ مشاہدات و تجربات اور ان کے نتائج سے منظم بحث کرتا ہے۔اس لیے تاریخ کی بنیاد تحقیق پر ہوتی ہے، جب اس تحقیقی مواد کو سپردِ قلم کیا جاتا ہے تو وہ ایک فن بن جاتا ہے۔ ٹائن بی (Toyenbee: 1979 -1889) اسی بنیاد پر کہتا ہے کہ تاریخ نویسی حیات انسانی کے علم کو منظم کرنے کا نام ہے:

> History is one of the ways of organizing knowledge.[34]

تاریخ کے معمے حل کرنے اور نتائج تک پہنچنے کے لیے حکیمانہ اصول درکار ہوتے ہیں۔ تاریخ کے کسی دور کا گہرا مطالعہ اور وسیع غور فکر، ایک فلسفیانہ کاوش ہے جس سے اس دور کے حقائق اور نتائج سامنے آتے ہیں۔یہ

نتائج اور حقائق خاص قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ مؤرخ ان حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے، اس تاریخی پس منظر کو پیش منظر کے آئینہ میں دیکھنے کی کوشش کرتا ہے ،یہی علم،فلسفہ تاریخ (Philosophy of History) کے نام سے جانا جاتا ہے۔

ہر واقعہ کی بنیاد اسباب اور علل پر ہوتی ہے۔جس طرح فعل اور خیال لازم و ملزوم ہیں، کسی بھی دور کے حالات واقعات اس دور کے محرک فکر کی عکاسی کرتے ہیں۔مؤرخ ماضی کو مردہ نہیں سمجھتا بلکہ وہ ماضی کے واقعات سے روح مسلسل کو ڈھونڈتا ہے۔ واقعات مر جاتے ہیں لیکن ان کی روح آنے والے واقعات میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔جب تک مؤرخ واقعات کی روح سے واقف نہ ہوگا تو وہ ماضی سے بے بہرہ رہے گا۔

لہٰذا، ایک اعلیٰ پائے کا مورخ،واقعات کی تشریح اور توضیح کرکے حیات انسانی کی ایک بامعنی تصویر کھینچتا ہے۔گویا فلسفہ تاریخ کا تعلق تاریخ کی حقیقی نوعیت اور علم تاریخ کی معنوی قدروں سے ہے۔ یہ دراصل تاریخی مواد کا فکری نچوڑ ہے۔[35]

اس نقطہ نظر کا ارتقاء علامہ عبدالرحمن ابن خلدون(1332-1406ء) کے ہاں اپنی جامع صورت میں نظر آتا ہے۔آیا تاریخ کو ماقبل کے حالات ہی سمجھا جائے یا یہ غور کیا جائے کہ ان حالات کی تہوں میں کوئی فلسفہ حیات بھی پنہاں ہے؟اور یہ جانچا جائے کہ کچھ قواعد اور معیارات ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن سے حالات کی صحت اور عدم صحت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے؟ اس سوال پر سب سے پہلے علامہ ابن خلدون نے غور کیا اور یوں انہوں نے تاریخ اور فلسفہ تاریخ کو ایک نیا موڑ دیا۔ قوموں کی معاشرتی تشکیل میں،ان کے ماضی،حال اور مستقبل کی کڑیاں ملا کر،ماضی کو حال میں زندہ کر دیا۔ قانون علت و معلول کے تحت ماضی کی تشریحات اس طرح کیں کہ حال کو جانچا جا سکے اور حال سے مستقبل کے متعلق پیشینگوئی کی جا سکے، جیسا کہ وہ فرماتے ہیں:

> لأنَّ الأخْبَارَ اِذَا اعْتُمِدَ فِيهَا عَلى مُجَرَّد النَّقْلِ وَلَمْ تُحْكَمْ أَصُولُ الْعَادَةَ وَ قَوَاعِدُ السَّيَاسَةَ وطَبِيعَةُ الْعُمْرَانِ وَ الأحْوَالُ فِى الاِ جْتِمَاعِ الاِنْسانى ولا قِيسَ الْغَائِبُ مِنْهَا بالشّاهِدِ وَ الْحَاضِرُ بِالذَّاهِبِ فَرُ بَّمَا لَمْ يُؤمَنْ فِيهَا مِنَ الْعُثُورِ وَ مَزَ لَّةِ الْقَدَمِ وَ الْحَيْدِ عَنْ جَادَّةِ الصّدْقِ وَكَثِراً مَا وَقَعَ للمُؤرّخِينَ وَالمُفَسّرِينَ وَأَ ئِمَّ النَّقْلِ مِنَ المَغَالِطِ فى الحِكَايَاتِ وَالْوَقَائعِ الاِعْتِمَادِهِمْ فِيهَا عَلى مُجَرَّد النَّقْلِ غَثّاً أَوْيَعْرِضُوهَا عَلى أصُولِهَا وَلَا قَاسُوهَا بِأشْباهِهَا وَلَا سَبَرُوها بِمعيَارِ الْحِكْمَةِ وَ الْوُقُوفِ عَلى طَبَائعِ الْكَائِنَاتِ وَ تَحْكِيمِ النْظَرِ وَ الْبَصِيرَةَ فى الأخْبَارِ۔ [36]

(اگر خبروں میں محض نقل پر اعتماد کر لیا جائے اور اصول عادت، قواعدِ سیاست مدنیت کی طبیعت اور معاشرے کے حالات کو پیچ نہ بنایا جائے اور موجود پر غائب کا حاضر پر قیاس نہ کیا جائے تو ان میں بہت لغزشوں اور غلطیوں کا اور راہِ راست سے ہٹ جانے کا امکان باقی رہتا ہے، چنانچہ مورخین اور مفسرین اور ائمہ نقل کو حکایات و واقعات میں بہت غلطیاں محض اس لیے پیش آئیں کہ انہوں نے صرف نقل پر خواہ غلط ہو یا صحیح قناعت کر لی اور واقعات کو ان اصول و معیار پر کس کر نہیں دیکھا اور اشباہ و نظائر پر قیاس نہیں کیا نہ انہیں حکمت و فلسفہ کی کسوٹی پر کسا اور نہ کائنات کی طبیعتوں پر پرکھا اور نہ ان پر نظر و بصیرت کو پیچ بنایا۔)

ابن خلدون کی اس سوچ کے بارے میں جدید دنیا کے عالمی مؤرخ ٹائن بی (1889-1979 :Toyenbee) کہتے ہیں:

> He has conceived and formulated a philosophy of History which is undoubtedly the greatest work of its kind that has ever yet been created by any mind in any time or place.[37]

(انہوں نے ایک فلسفہ تاریخ سوچا اور تشکیل دیا، جو اپنی نوعیت کا عظیم ترین کام ہے، جو کبھی کسی زمان و مکان میں، اب تک تخلیق نہیں کیا جا سکا۔)

برصغیر کے جدید علمائے تاریخ:

برصغیر کے جدید مفکر اور مؤرخ، علامہ شبلی نعمانی(1857–1914ء) کا خیال ہے کہ تاریخ کا نصب العین ان واقعات اور حالات کا پتہ چلانا ہے کہ موجودہ زمانہ گذشتہ زمانہ سے نتیجتاً کیسے پیدا ہوا۔ علامہ شبلی، علامہ ابن خلدون کے اس نظریہ کے ساتھ متفق ہیں کہ ہر دور کا اپنا مزاج ہوتا ہے اس لیے اس دور کے معاشرتی، ثقافتی اور ذہنی نقوش کو اس قدر ابھارا جائے کہ پڑھنے والے کے ذہن میں اس دور کا مکمل نقشہ بن جائے۔[38]

وہ لکھتے ہیں:

> علم تاریخ اپنے اندر وسیع تر مفہوم رکھتا ہے۔ اس میں جامعیت بھی ہے اور ہمہ گیریت بھی۔ یہ کئی ایک علوم سے بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق وواسطہ رکھتا ہے۔ یہ انسانی مطالعہ کا دوسرا نام ہے۔ اس کے لئے اسے علوم کی گئی ایک شاخوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ اپنے نفس مضمون کے اعتبار سے اس کا اقوام و ملل اور تہذیبوں وتمدنوں

سے گہرا تعلق ہے۔آج دنیامیں جو تمدن، معاشرت، خیالات اور مذاہب موجود ہیں۔سب گذشتہ واقعات کے نتائج ہیں۔[39]

جس طرح تاریخ اور اس کا علم کمال کی چیز ہے اسی طرح تاریخ لکھنا بھی ایک خاص فن ہے۔تاریخ نویسی، دراصل، تاریخی واقعات اور حقائق وقرائن کوان کی روح کے مطابق قلم بند کرنے کا دوسرا نام ہے۔اس فن میں کمال مؤرخ کی صلاحیت، قوت مشاہدہ اور زور قلم پر منحصر ہوتاہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ مؤرخ کسی واقعہ کو حقیقت کے آئینے میں کس طرح متشکل کرتا ہے۔

علامہ شبلی ابن خلدون کے نظریہ عصبیت کو تہذیبوں کے عروج وزوال کا سبب نہیں کہتے بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ قومی بقاصالحیت میں ہے، جب تک صالحیت قائم رہے گی تہذیب بھی قائم رہے گی اور ترقی کی منازل طے کرے گی۔وہ لکھتے ہیں:

کچھ چیزیں تاریخ سے بطورروایتاورثہ میں ملتی ہیں اس لیےترقی کاہر قدم ماضی کی اساس پر ہوناچاہیے ۔لوگ کہتے ہیں آگے بڑھومیں کہتاہوں کہ پیچھے ہٹوکہ صحابہ کے دورمیں چلے جاؤاوراس سے بھی اور پیچھے ہٹوکہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں پہنچ جاؤ۔ پیچھے ہٹنے سے مراد حضور ﷺ کی پیداکی ہوئی فضااورروح تک پہنچناہے۔اوراسی ماضی کی اساس پر مستقبل کوترتیب دیناہے۔[40]

عالم اسلام کے عظیم مفکرعلامہ اقبال(1877–1938ء) فرماتے ہیں کہ: تاریخ ایک طرح کا گراموفون ہے جس میں قوموں کی صدائیں محفوظ ہیں۔[41] ماضی کے واقعات کو ترتیب وار لکھنے کا نام تاریخ نہیں بلکہ اسباب وعلل کے باہمی ربط کو جاننے اوران کی روشنی میں قوموں کے عروج وزوال کے اصول اخذ کرنے کا مفہوم بھی شامل ہے۔علامہ صاحب سمجھتے ہیں کہ قرآن نے جہاں فطرت کو علم کا ایک ذریعہ قرار دیاہے اسی طرح تاریخ بھی ذریعہ علم ہے۔آپ کے نزدیک تاریخ وہ آئینہ ہے جس میں انسانی ارتقاء کی پوری تصویر نظر آتی ہےاورانسان اس کو دیکھ کر اپناآپ سنوارتاہے۔اسلامی ثقافت کی روح، خطبہ نمبر پانچ میں فرماتے ہیں کہ:

علم انسانی کے قرآن کے نزدیک دوسرچشمے ہیں ایک عالم فطرت اور دوسرا عالم تاریخ۔[42]

قرآن مجید میں پہلی قوموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سورۃالانعام میں فرمایا گیاہے کہ ماضی میں جھانکنے اور درس عبرت حاصل کرنے کے لیے، ماضی کے آثار کا مشاہدہ کیاجائے:

﴿قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ﴾[43]

(آپ کہہ دیجیے کہ زمین میں سیر کرو اور پھر دیکھو کہ حقیقت جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا۔)
یہ اس بات کا اعلان ہے کہ گزرے ہوئے واقعات علم و بصیرت کا منبع ہیں اور اعلیٰ نصب العین کے حصول میں تاریخ انسان کی رہنمائی کرتے ہے۔اسی انفرادی اور اجتماعی محاسبہ کے لیے قرآن بار بار تاریخ کا حوالہ دیتا ہے۔

علامہ اقبال کے مطابق، تاریخ زمانہ کے اندر ایک مسلسل حرکت کا نام ہے، اس لیے اس کی نوعیت تخلیقی ہے۔قرآن مجید نے تاریخ کو ایّام اللہ سے تعبیر کیاہے ۔زندگی کی یہ مسلسل ارتقائی حرکت جس میں گزرے ہوئے افراد و اقوام کی تخلیقی اور تحریبی اعمال سے آئند نسلوں کی تربیت منسلک ہوتی ہے۔اسلام کے ہاں بنیادی قدر حرکت یعنی عمل ہے۔ قرآن مجید سور فاتحہ میں اسی عملی پہلو کی طرف رہنمائی کرتاہے۔لہذا عمل کیاہے صراط مستقیم، صراط مستقیم کیاہے؟ حرکت، حرکت کیاہے؟تاریخ کے تناظر میں وہ قوت ہے جو انسان کو ماضی کے ساتھ جوڑے ہوئے بہتر، روشن، منزہ اور مقدس مستقبل کی طرف لے کر جاتی ہے۔[44]

اقبال کے خیال میں تاریخ قوم کا حافظہ ہے، اگر حافظہ میں خلل پیدا ہو جائے تو دماغی توازن قائم نہیں رہتا انسان پگلا جاتاہے۔ اسی طرح جو قومیں اپنے ماضی یعنی تاریخ سے ناآشنا ہوتی ہیں اور ماضی سے اپنا رشتہ توڑ لیتی ہیں وہ اپنی روایات سے بیگانہ ہو جاتی ہیں وہ بحیثیت قوم کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

سر زند از ماضی تو حال تو　　　خیز داز حال تو استقبال تو
مشکن از خواہی حیات لازوال　　　رشتہ ءماضی از استقبال و حال[45]

(تیرا حال تیرے ماضی سے پھوٹتاہے اور حال سے استقبال نکلتاہے، اگر تو حیات لازوال کا خواہاں ہے تو پھر اپنے ماضی کا رشتہ اپنے حال و استقبال سے قطع نہ کر۔)

اسی طرح وہ فرماتے ہیں:

روح را سرمایہ تاب است ایں　　　جسم ملت را چو اعصا باست ایں
ہمچو خنجر بر فسانت می زند　　　باز بر روے جہانت می زند[46]

(تاریخ روح کے لیے آب حیات کا سرچشمہ ہے۔اور قوموں کے جسم میں اسے رگ و پے کی حیثیت حاصل ہے۔یہ پہلے تجھ تلوار کی طرح سان پر لگاتی ہے، پھر اٹھا کر دنیا کی کشمکش گاہ میں پھینک دیتی ہے کہ جو کچھ انجام دے سکتاہے انجام دے۔)

علامہ صاحب گذشتہ کو حال میں پیوستہ دیکھتے ہیں اور یوں تاریخ کا حیاتیاتی عمل اور انسانی ارتقاء کھل کر سامنے آجاتا ہے۔علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سٹوڈیٹس یونین کے سپاس نامہ کے جواب میں نومبر ۱۹۲۹ء کی تقریر میں، اقبال نے فرمایا:

میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو صرف اپنے ماضی سے محبت کرتے ہیں۔ میں تو اپنے مستقبل کا معتقد ہوں۔ ماضی کی ضرورت مجھے اس لیے ہے کہ میں حال ہوں۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ چشمہ تہذیب وشائستگی کو سمجھا جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ آج دنیائے اسلام میں کیا ہو رہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ ماضی کو سمجھیں۔ [47]

گویا اقبال کی نظر میں ،تاریخ دانش و بصیرت کا مرقع ہے۔اس کا مطالعہ ماضی کا شعور دیتا ہے۔اور مستقبل کے لیے بصیرت عطاء کرتا ہے۔آپ نے بہت سے تاریخی کرداروں کو شعری جامہ پہنایا ہے اوران کے اخلاقی روحانی کردار کوامت کے سامنے رکھا ہے۔ اور علامہ اقبال وہ پہلے فلسفی ہیں جنہوں نے روحانی تجربات کو فلسفیانہ بنیادوں پر پرکھنے کی کوشش کی۔وہ کہتے ہیں:

تاریخ ایک قسم کی اطلاقی اخلاقیات ہے۔ اگراخلاقیات دیگرعلوم کی طرح ایک تجرباتی علم ہے تو اسے انسانی تجربے کے انکشافات پر مبنی ہونا چاہیے ۔ [48]

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی(1903–1979ء) علمی اور فکری دنیا میں ایک ممتاز مقام رکھتے تھے۔آپ کی تاریخ پر بڑی دقیق نظر ہے۔اگرچہ آپ نے باقاعدہ نظریہ تاریخ پہ کوئی مستقل کلام نہیں کیا مگر ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی متعدد تاریخی تحریروں سے انداز ہوتا ہے کہ آپ کے تاریخ کے بارے نظریات کیا تھے۔ آپ کا نظریہ حیات تاریخ قرآن وسنت سے ماخوذ ہے۔آپ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ :

قدیم اور جدید فلسفہ، سائنس، معاشیات،سیاسیات،وغیرہ اچھی خاصی لائبریری دماغ میں اتار چکا ہوں، مگر جب آنکھ کھول کر قرآن کو پڑھا تو بخدا یوں محسوس ہوا کہ جو کچھ پڑھا تھا ہیچ تھا۔علم کی جڑ تو اب ہاتھ آئی ہے۔کانٹ، ہیگل، نطشے،مارکس اور دنیا کے بڑے بڑے مفکرین اب مجھے بچے نظر آتے ہیں۔بے چاروں پر ترس آتا ہے کہ ساری عمر جن کھیتوں کو سجاتے رہے اور جن مسائل پر بڑی بڑی کتابیں تصنیف کرڈالیں،پھر بھی نہ حل کرسکے۔ اس کتاب قرآن نے دو فقروں میں حل کر کے رکھ دیئے۔ [49]

سیّد مودودی کے تصور تاریخ کی بنیاد قرآن مجید ہے۔آپ نے جن تاریخی موضوعات پر قلم اٹھایاہے قرآن مجید کے بیان کردہ تاریخی حقائق کی روشنی میں اس کی وضاحت کی۔ وہ اسلامی تناظر میں تاریخ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> اگرایک مسلمان صحیح اسلامی ذہنیت کے ساتھ تاریخ کامطالعہ کرے تواس کافریضہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہووہ واقعات کوجیسے کہ وہ فی الواقع گزرے ہیں بلاکسی تعصب جوں کے توں سامنے رکھے،اور پھراسلام نے جومعیار حق وباطل اس کودیاہے،اس کے مطابق اشخاص،اقوام اوراداروں کے رویوں کو جانچ کربےلاگ نتائج اخذکرے، غلطی جہاں ہو، کوتاہی جہاں بھی پائی جائےاسے بےتکلف وہیں انگلی رکھ دینی چاہیے،اور کھوج لگاناچاہیے کہ اس کی پیدائش کے اسباب کیاہیں اوراس نے انسانی فلاح وسعادت پر کیااثرڈالاہے۔ خوبی جہاں اور جس میں بھی نظرآئے،بےتکلف اس کاادراک کرناچاہیےاوراس کے مفید نتائج یابےنتیجہ رہ جانے کے اسباب کاسراغ لگاناچاہیے۔ ٹھیک یہی رویہ ہےجوقرآن میں سوانح اشخاص اور تاریخ اقوام سے بحث واستدلال کرتے وقت اختیار کیاگیاہے۔ 50

سیدمودودی تاریخ ساز شخصیات کاتنقیدی جائزہ لینے کے قائل ہیں تاکہ پتہ چلایاجاسکے کہ اس دور کے لحاظ سےان شخصیات سے کیاغلطیاں سرزدہوئی ہیں یاوہ کون سےایسے کام ہیں جوانہیں کرنے چاہیے تھے ۔چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ:

> ہمیں اپنی پچھلی تاریخ کی طرف پلٹ کردیکھناہوگاکہ ان بہت سی صدیوں میں ہمارے مختلف لیڈروں نے کتناکام کس کس طرح کیاہےاوران کے کارناموں سے ہم کس حدتک فائدہ اٹھاسکتے ہیں اوران سے کیاچھوٹ گیاہے جس کی تلافی پراب ہمیں متوجہ ہوناچاہیے۔ 51

تاریخ میں موجوداور مضمر حقائق سے جب تک پردہ نہیں اٹھے گااس وقت تک ہم تاریخ سے کوئی خاطرخواہ نتائج اور فوائد حاصل نہیں کرسکتے۔جب تک حقائق کی تلاش میں واقعات کی جزئیات کی تحقیق نہ کی جائے گی تواس وقت تک اصلیت ہماری نظروں کے سامنے نہیں آئے گی۔اور پھراسکااصل تصور کوئی اور ہوگااور ہم کسی اور طرف جارہے ہوں گے۔مولانافرماتے ہیں کہ:

> پوری انسانی تاریخ دراصل دومقابل طاقتوں کی کش مکش کی تاریخ ہے ۔ایک اسلام یعنی دین فطرت کی قوت اور دوسری جاہلیت یعنی مسخ شدہ فطرت انسانی کی قوت۔ اس کش مکش میں کبھی اسلام ابھرتاہےاور جاہلیت دب جاتی ہےاور کبھی جاہلیت ابھرتی ہےاوراسلام دب جاتاہے۔ 52

انسان اس کش مکش میں ایک واسطہ کی حیثیت رکھتا ہے۔اب یہاں اس کو یہ فہم پیداء کرنے کی ضرورت ہے کہ اس مقابلہ میں آیاوہ کس کے ساتھ ہےاوراپنے کردار و عمل کے ساتھ کس طرف کھڑاہے ۔چنانچہ مولانافرماتے ہیں کہ :

اسلام اور جاہلیت کے نازک اور باریک فرق کو بالکل واضح صورت میں بہت کم لوگ محسوس کرتے ہیں زیادہ ترلوگ ان دونوں کو خلط ملط کر کے کچھ اس طرح پراگندہ خیالی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ کام تو جاہلیت کے لیے کر رہے ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں اسلام کے لیے کر رہے ہیں۔[53]

خلاصہ بحث:

کسی بھی دور کے حالات وواقعات اس دور کے فکری ارتقاء کے ضامن ہوتے ہیں۔لہذا ہر واقعہ اسباب علل کا مرقع ہوتا ہے۔مؤرخین میں سے اکثر مؤرخین کا یہی طریقہ رہا ہے کہ انہوں نے واقعات کو تشریح اور توضیح کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔جب کہ مسلم مؤرخین کا نظریہ تاریخ قرآن مجید سے مستنبط ہے۔انہوں تاریخ کی تدوین بھی اسی انداز سے کی جس انداز سے وہ قرآن، حدیث اور سیرت کی تدوین کر چکے تھے۔ وہ تاریخ کو ذریعہ علم سمجھتے تھے۔ان کے خیال میں گذشتہ قوموں کے واقعات آنے والی قوموں کے لیے سبق آموز اور بہتر زندگی کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔

ابن مسکویہ کے مطابق ماضی کے واقعات اور قصص کو اسباب اور علل تحت دیکھا جانا چاہیے جب کہ ابن خلدون کے مطابق حالات کی تہوں میں فلسفہ حیات پنہاں ہوتا ہے جس کو جان کر ماضی تشریحات کر کے حال جانا جاتا ہے اور مستقبل کے متعلق پیشین گوئی کی جاتی ہے۔ برصغیر کے مسلم مؤرخین میں ضیاء الدین برنی مؤقف ہے کہ تاریخ سے یہ سبق سیکھنا ضروری ہے کہ گذشتہ زمانے کے افراد کو کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑااور کون سی وہ تدابیر تھیں جن کے تحت وہ ان سے باہر آئے اور ہمارے لیے ان میں کیا سبق موجود ہے۔ ملاعبد القادر بدایونی اس عالم میں رونما ہونے والے ہر سانحہ اور حادثہ کو قدرت کی حکمت کا نتیجہ سمجھتے ہیں تو علامہ شبلی قوموں کے عروج کا سبب صالحیت کو قرار دیتے ہیں ۔

علامہ اقبال تاریخ کو گراموفون کی مانند سمجھتے ہیں جس میں قوموں کی صدائیں محفوظ ہیں،آپ تاریخ کو ایک مسلسل ارتقائی حرکت قرار دیتے ہیں جس کے ساتھ آئندہ کی نسلوں کی تربیت منسلک ہوتی ہے اور یہ وہ حافظہ ہے جس کے بغیر ذہنی توازن قائم نہیں رہتا۔ مولانا مودودی تاریخ کے بیان میں کسی معذرت خواہانہ رویہ کے قائل نہیں ہیں بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ کسی مطالعاتی تجزیے میں ضروری حقائق کو بلا کم و کاست سامنے لانا بہت ضروری ہے، خواہ وہ کتنے ہی تلخ ہوں، بصورت دیگر، مستقبل کی صورت گری گہنا جائے گی۔

حواشی و حوالہ جات

1 السخاوی، عبدالرحمٰن شمس الدین۔الاعلان بالتوبیخ۔بیروت: موسسہ الرسالہ 1986ء، ص:16

2 A Greek English Dictionary, Oxford: Clarendon Press, 1996, “History”

3 R.G Collingwood. The Idea of History, UK: Oxford University Press, 1946, p: 11.

4 Aristotle, The Poetics (Translated by S H Butcher) London: Macmillan, 1902, p: 45

5 Toynbee, Arnold j. A Study of History, London: Oxford University Press, 1935 Vol: III, p: 255

6 الرعد 13 : 11

7۔ الملک:01

8۔ یٰسین: 38-40

9۔ الروم:30

10۔ فاطر : 43

11۔ زمخشری، ابوالقاسم محمود بن عمر، **الکشاف** ،(دار لکتاب العربی، بیروت، 1406ھ)، 1: 417

12۔ ابن تیمیہ، **مجموع الفتاویٰ**، (وزارۃ الشون الاسلامیہ والاوقاف والدعوۃ والارشاد، 2004ء)، 3: 20

13۔ رشید رضا، محمد رشید رضا، **تفسیر المنار** ،(بیروت: دار المعرفۃ، س،ن)، 4: 139

14 ابن تیمیہ، ابوعباس احمد بن عبدالحلیم، **جامع الرسائل** ،(المجموعۃ الاولی، تحقیق: د. محمد رشاد سالم، القاھرۃ : مطبعۃ المدني، 1984ء)، 52

15۔ زیدان، عبدالکریم، السنن الالھیہ فی الامم والجماعات والافراد فی الشریعۃ الاسلامیۃ، (بیروت: موسسہ الرسالۃ، 1993ء)، 24-25

16۔ لقمان: 20؛ البقرۃ: 29

17۔ الدھر:3

18۔ النمل: 40

19 . Fazalurrehman, *Major Themes of The Quran*, (Chicago: University of Chicago),p.16

20۔ پرویز، غلام احمد، **سلیم کے نام** ,(لاہور: طلوع اسلام ٹرسٹ، 1998ء)،3: 105

21۔ اقبال، علامہ محمد اقبال، **کلیاتِ اقبال** اردو(ضربِ کلیم)،(لاہور: اقبال اکیڈمی پاکستان، 1990ء)، 578

22

23۔ یونس10: 49

24 ایضاً:44

25۔ المسعودی، ابوالحسن بن حسین بن علی۔ مروج الذہب۔ مصر: مطبعۃ البہیہ قاہرہ، 1342ء ج:1، ص: 3

26۔ ابن مسکویہ، احمد بن محمد۔ مقدمہ تجارب الامم۔ بیروت: دار الکتب العلمیہ، 2003ء، ص:60

27 برنی، ضیاءالدین۔ تاریخ فیروز شاہی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، 2005ء، ص :18

28 ایضاً، ص: 48

29 ایضاً، ص: 50

30 علامہ ابن خلدون، عبدالرحمٰن۔ المقدمہ۔ بیروت: دارالفکر 2003ء، ص:13

31 بدایونی، ملا عبدالقادر۔ منتخب التواریخ۔ لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، (س،ن)، ص:323

32 ایضاً، ص:328

33 حاجی خلیفہ، مصطفٰی بن عبداللہ۔ کشف الظنون، بیروت: دارالحیاء التراث، ج:1، ص:271

34 Toynbee, Arnold j. A Study of History, p: 255

35 Ludwlg Von Misses.Theory and History, London: OUP.1985, p:225

36 علامہ ابن خلدون۔ المقدمہ۔ ص: 32-33

37 Toynbee, A Study of History, Vol: III, p: 322.

38 نعمانی، علامہ شبلی۔ الفاروق۔ لاہور : مکتبہ نعمانیہ، ص:25

39 ایضاً، ص:26

40 ایضاً، ص:28

41 ڈاکٹر افتخار احمد۔ شذرات فکر اقبال۔ لاہور: مجلس ترقی اردو ادب، ص: 140

42 اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ۔(مترجم سید نذیر نیازی) لاہور: بزم اقبال، 2012ء، ص: 194

43 الانعام6 : 11

44 علامہ اقبال۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ۔(مترجم سید نذیر نیازی)، ص:194

45 علامہ اقبال۔ کلیات (فارسی)۔ لاہور: مکتبہ دانیال، ص:230

46 ایضاً۔ ص: 229

47 رفیق افضل، محمد۔ گفتار اقبال۔ لاہور: دانش گاہ پنجاب، ص: 105

48 ڈاکٹر افتخار احمد۔ شذرات فکر اقبال۔ ص: 79

49 ندوی، محمد عمران۔ مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں۔ اعظم گڑھ: معارف پریس، (س،ن)، ص: 27

50 خورشید احمد، پروفیسر۔ ادبیات مودودی۔ ص: 260

51 سید مودودی، ابو اعلیٰ۔ تجدید واحیائے دین۔ لاہور :اسلامک پبلیکشنز، ص:9

52 خورشید احمد ، پروفیسر۔ ادبیات مودودی۔ ص:217

53 سید مودودی۔ دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ؛ سیاسی تعلقات پر ایک نظر۔ دہلی : جید برقی پریس، 1928ء، ص:3